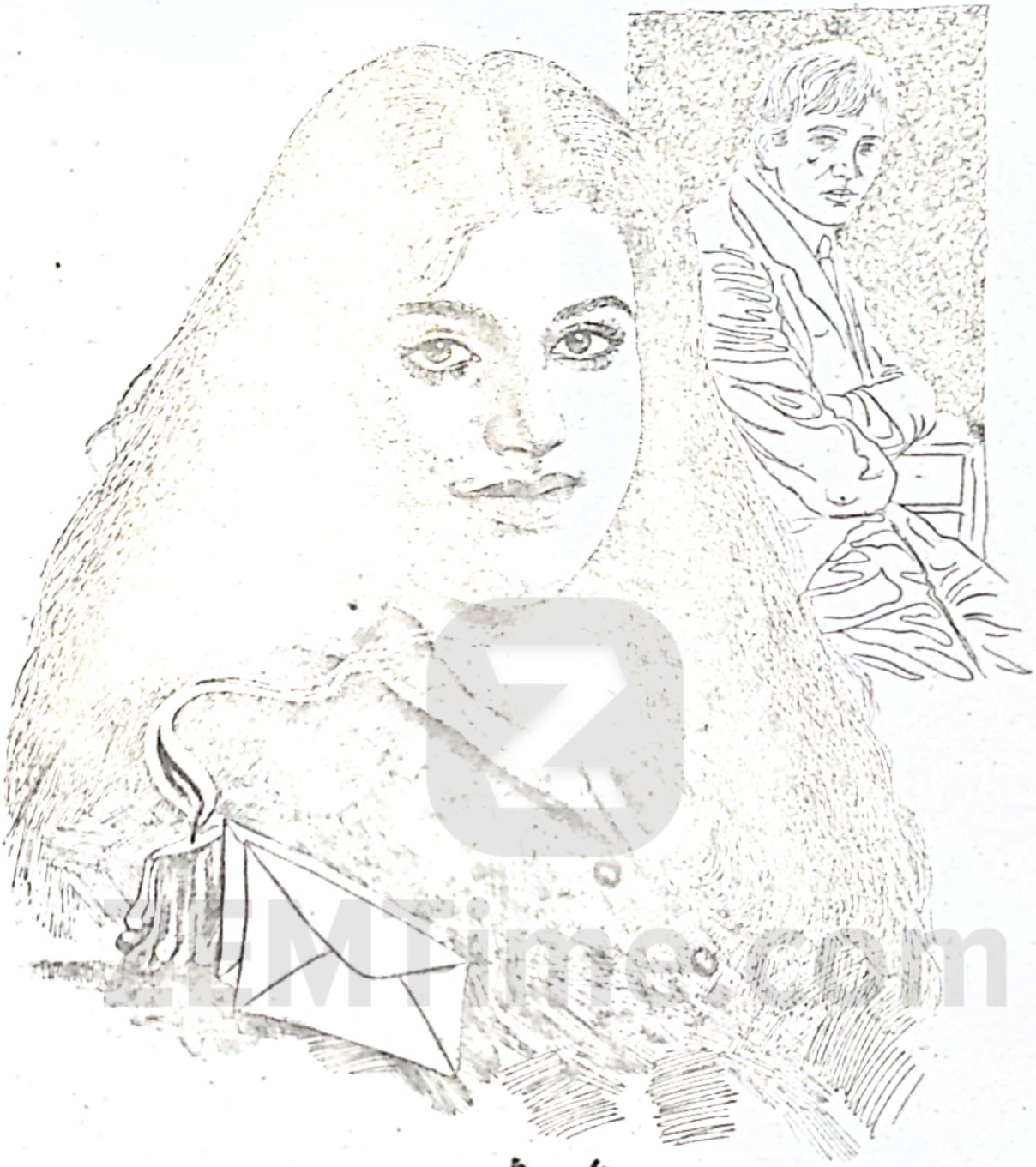

نصرت شمسی

کفارہ

میرے ہاتھ میں ہندوستان سے آیا ہوا آپا کا خط تھا اور یہ کوئی پہلا خط نہیں تھا۔ پچھلے تین ماہ میں تینوں بہنوں کے کئی خط آچکے تھے کہ

"منور بھائی اب اپنے ملک لوٹنے کا وقت آچکا ہے، لوٹ آؤ۔"

میں خط پڑھ کر حیران تھا کہ اب کیا کروں؟ میرے سامنے میرے دونوں بچے تھے جو ہندوستان سے دور بیرونی مٹی میں پلے بڑھے تھے۔ جن کی

www.zemtime.com

زندگی وہاں کی زندگی سے بالکل مختلف تھی۔ آخر یہ بچے اس تہذیب کو کیسے اپنائیں گے اور کیسے وہاں رہ پائیں گے؟ میرے دونوں بچے اپنی زندگی میں بالکل آزاد تھے جنہیں نہ کوئی تربیت مل رہی تھی نہ کوئی ماحول، ایک مشینی زندگی تھی جو اپنے آپ چل رہی تھی۔

میری بیوی جو روز صبح سب سے پہلے تیار ہو کر گاڑی لے کر آفس کے لیے نکل جاتی۔ اس کے بعد میڈ آتی اتنی دیر میں دونوں بچے اسکول کے لیے تیار ہو جاتے۔ وین آتی اور وہ اسکول کے لیے چلے جاتے۔ میڈ گھر کے سارے کام کرتی، میرا ناشتہ تیار کرتی اور چلی جاتی۔ اس کے بعد میں بھی شام تک کے لیے گھر سے چلا جاتا۔

دوپہر کے وقت بچے آتے۔ لنچ کے نام پہ کبھی میگی، کبھی برگر، کبھی پیزا، کھا کر اپنے اپنے کمروں میں چلے جاتے۔ دن بھر گھر میں کیا ہوتا اس کا علم نہ مجھے ہوتا نہ میری بیوی کو، رات کے کھانے کے لیے ہم ضرور ٹیبل پہ جمع ہوتے اور وہی سوکھا سوکھا مختلف قسم کی ساسیس اور چٹنیوں سے کچھ نہ کچھ کھا لیتے اور سو جاتے۔

اس ماحول کے بچے اس ماحول میں کیسے رہ پائیں گے؟ میں نے تو کبھی اپنی تہذیب کی ''ت'' بھی نہیں سکھائی پھر بھلا یہ وہاں کے ماحول میں کیسے رہیں گے؟

میری آنکھوں کے سامنے میرے گھر کا دسترخوان ڈول گیا۔ کبھی شلجم گوشت، کبھی آلو گوشت، کبھی گاجر، چقندر، ان کھانوں کی لذت وہ کیا جانیں۔ اماں کیسے مزے کے کھانے پکایا کرتی تھیں۔ ان کے ہاتھ کا شلجم گوشت آہا..... ہا اور جاڑوں میں اڑد کی دال کی کھچڑی جس میں اماں دیسی گھی چمچہ بھر بھر کے ڈالا کرتی تھیں اور وہ سب ابا کے ساتھ چٹائی پر بیٹھ کر چولہے کے پاس کیسے لطف لے لے کر کھایا کرتے تھے۔

بیچ بیچ میں ابا انگلیاں چاٹتے تو ہم سب کو بھی ''ہوں'' کر کے اشارہ کرتے اور پھر ہم سب بھی اپنی انگلیاں چاٹنے لگتے۔

اسے یاد آیا۔ انہی انگلیوں سے ابا کبھی کبھی اماں کے منہ میں کھچڑی کا نوالہ دے دیا کرتے تھے اور اماں جسے بڑے مزے سے کھایا کرتی تھیں۔

نہ تو ان چاٹی ہوئی انگلیوں سے اماں کو کبھی کراہیت آئی اور نہ ہی دوبارہ ان سے اپنے منہ میں لقمہ لے جانے میں ابا کو کچھ محسوس ہوا۔ اور وہ.....

اس نے تو آج تک اپنی بیوی کی پلیٹ سے ایک نوالہ بھی لگا کر نہیں کھایا تھا۔ اس کی بیوی تو ویسے بھی وہمی عورت تھی اس کا تو چمچہ، پلیٹ، کانٹا سب بالکل الگ تھا۔

جسے نہ کوئی چھو سکتا تھا اور نہ اس میں کھا سکتا تھا۔ آہا.....

ایک وہ ماحول اور ایک اس کا ماحول، اس کے بچوں نے تو اس تہذیب کو، اس مٹی کو کبھی دیکھا ہی نہیں رہنا تو بہت دور کی بات تھی اور غلطی اسی کی تھی۔ میں کیوں اپنی مٹی کے رنگوں کو چھوڑ کر غیر کے رنگوں میں ڈوب گیا اور اب جب نکلنے کا وقت تھا تو وہ رنگ اتنے پکے ہو چکے تھے کہ ان سے پیچھا چھڑانا اب ناممکن بات تھی۔

اسے یاد آیا کیسے مہمانوں کی آمد پر گھر بھر میں رونق ہو جایا کرتی تھی۔ اس کے ابا جاڑوں میں اپنی بہنوں کی پائے کی دعوت کیا کرتے تھے۔ ایک ہفتہ پہلے ہی ابا اماں سے مشورہ کرتے اور پھر وہ ابا کی انگلی پکڑ کے ایک ایک کے گھر دعوت دینے جایا کرتا۔ ابا ساتھ میں کچھ کھانے پینے کا سامان بھی لے کر جایا کرتے اور بڑی عزت و احترام سے بہنوں کو دعوتیں دے کر اماں کو آ کر بتاتے کہ سب سے بات پکی ہو گئی ہے۔

اس کی بہنیں دعوت سے تین دن پہلے گھر کے کاموں میں لگ جاتیں۔ کوئی پردے بدلتی، کوئی گھر

www.zemtime.com

کی جھڑائی، صفائی، تو کوئی برتن نکال کر صاف کر کے رکھتی۔ گھر کا کونا کونا دھو دھلا کر چمکایا جاتا۔

اگلے دن ابا بازار سے کھانا پکانے کا سامان لانا شروع کرتے اور اماں کھانے پکانے میں لگ جایا کرتیں۔ دعوت والے دن صبح سے کوئی بہن چادریں بدلتی، کوئی فرش لگاتی، کوئی اماں کے ساتھ باورچی خانے میں گھس جاتی۔ باورچی خانے سے آنے والی اشتہا انگیز خوشبو بھوک کو جیسے چمکا دیتی۔ ہم سوچتے دن میں بھی کچھ اچھا ملے گا لیکن اماں مونگ یا مسور کی کھچڑی دہی، چٹنی، اچار سے کھلا کر کہتیں کہ

"پیٹ بھی ہلکا رہے گا اور میرا کام بھی، شام کو اچھا کھانا کھا لینا۔" اور ہم بے چینی سے رات کے کھانے کا انتظار کرنے لگتے۔

شام ہوتے ہوتے گھر سج کر تیار ہو جاتا۔ ابا سینکڑوں چکر باورچی خانے کے لگا کر اماں سے پوچھتے رہتے۔

"کچھ لانا تو نہیں ہے سب کچھ ہو گیا۔"

اماں کے اندر باہر کے ہزار ہا چکر لیکن ماتھے پر ایک شکن بھی نہیں۔

عصر، مغرب کے درمیان مہمان آنا شروع ہو جاتے۔ اندھیرا ہونے سے پہلے باجی، آپا مل کر بڑے سے دالان میں دسترخوان سجانے لگ جاتیں۔ چاندنیاں بچھائی جاتیں اور یہاں سے وہاں تک کپڑے کا دسترخوان اماں کے جہیز کے چینی کے برتنوں سے سج جاتا۔

آپا بار بار کبھی ایک چادر کا کونا درست کرتیں تو کبھی دوسری کا۔ مہمانوں سے گفتگو، موسمی پھلوں سے تواضع اور ہنسی خوشی کا ماحول، اسی ماحول میں کھانے کا وقت آ جاتا۔ اور سب اماں کے ہاتھ کے بنے لذیذ کھانوں میں مشغول ہو جاتے۔ چمچوں، پلیٹوں کی آوازیں کتنی بھلی لگا کرتی تھیں۔ اماں بار بار خالی ہونے والے ڈونگے بھر بھر کے لاتیں۔ کتنا مزا آتا تھا ان دعوتوں میں۔ کہاں وہ ماحول، کہاں یہ ماحول..... دعوت کے نام پر آج تک کوئی اس گھر میں نہیں آیا تھا۔ جب کسی کا دل کسی کو کچھ کھلانے پلانے کو چاہتا تو ٹیبل بک کراتا اور چلا جاتا۔ اس کے یہاں تو عید، بقرعید کا تصور بھی نہیں تھا۔ اس کے بچوں کو پتا ہی نہیں تھا کہ تہوار کسے کہتے ہیں؟

کیسے لوٹے وہ.....؟ لیکن جانا تو تھا یہ تو اس نے طے کر لیا تھا اگر اب نہ گیا تو ساری عمر پچھتاتا رہے گا۔

☆☆☆

اس نے رات کو میز پر سب کو بتایا کہ اب وہ لوگ انڈیا جانے والے ہیں۔

"واؤ..... انڈیا اماں، بابا کے پاس"۔ بچوں نے انجانی خوشی محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں بیٹا"۔

"کب ڈیڈ؟"

"بہت جلد شاید اگلے ہفتے تم لوگ پیکنگ کر لو۔"

"او کے ڈیڈی"

منور نے خاموش بیٹھی کو پکارا، جو اتنے عرصے میں اس کی زبان سمجھنے لگی تھی اور بچے بھی، بس اتنا ہی ہندوستان زندہ تھا ان کی زندگی میں۔

"وہاں بابا بہت بیمار ہیں، انہیں میری ضرورت ہے۔ اور اب شاید ہم کبھی واپس نہیں بھی نہ لوٹ پائیں۔ دیکھو میں ابھی یہ نہیں کہہ رہا کہ تم ہمیشہ کے لیے رک جانا لیکن رفتہ رفتہ عادت تو ڈالنا ہے پلیز۔"

"منور! دیکھو اس معاملہ میں ضد نہ کرنا۔ میں اور بچے وہاں ایڈجسٹ نہیں ہو پائیں گے۔ اگر ہم رک نہ سکے تو ہمیں واپس آنا ہی ہوگا۔"

جہاز میں بیٹھتے ہی وہ پھر اپنی مٹی سے جڑ گیا۔ اسے یاد آیا کہ دو ماہ بعد عید بھی تو آنے والی ہے۔

اوہ! عید..... عید کا خیال آتے ہی بیس بائیس سال پہلے کی عید یاد آ گئی۔ کتنا خوبصورت منظر ہوا کرتا

www.zemtime.com

تھا رمضان کا، اور رمضان کا آخری عشرہ تو عبادتوں میں یوں گزر جاتا تھا کہ پتا ہی نہ چلتا۔ دن میں عید کی تیاریوں کا ذکر، فکر اور رات کو عبادتیں، اور وہ چاند رات، کتنا خوبصورت سماں ہوا کرتا تھا اس وقت محلے کا۔ کیا اب بھی ویسا ہی ہوتا ہوگا؟

ہو سکتا ہے کیونکہ ہندوستانی بہت جلد اپنی تہذیب اور روایات کو نہیں بھولتے اور کہیں نہ کہیں زندہ ہی رکھتے ہیں۔ کیسے مزے کی عید کی رونقیں ہوا کرتی تھیں۔ سارا محلہ چندہ جمع کر کے سب کے گھر سجواتا۔ محلے کے بڑے بزرگ اپنے اپنے گھروں کے باہر چوپال سی لگا کر بیٹھ جاتے۔

کسی کی چارپائی، تو کسی کا تخت، کھانے پینے کی چیزیں، چائے کی کیتلیاں، شربت کے گلاس، ہنسی مذاق، حقوں کا دھواں، اور محلے بھر کے شور مچاتے بچے۔ عورتوں کی آمد و رفت، بازار کے چکر، چوڑی، مہندی بیچنے والوں کی آوازیں، گھروں میں پکتے ہوئے پکوانوں کی خوشبو اور ماحول میں جلترنگ بکھیرتی لڑکیوں کی ہنسی۔

کوئی اس کی اماں سے چھوٹی الائچی لینے آتا تو کہیں اماں اسے دوڑاتیں کہ تیزپات کے چند پتے لے آ۔ کوئی لیموں پوچھنے آتی، تو کوئی دہی کی چٹنی پوچھنے آتا۔ باورچی خانے میں خوشی خوشی سر دھنتی عورتیں، برتنوں کے کھڑکنے کی آوازیں، پٹاخوں کا شور تو ایک طرف، عید پر پہنے جانے والے کپڑوں کی بہار۔

ہائے اماں کے ہاتھ کی لذیذ سویاں اور دہی بڑے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اماں کے ہاتھ کے بڑے بڑے پتلے پتلے دہی بڑے گھوم گئے اور اس کے منہ میں پانی سا بھر آیا۔ آہا اسے پلیٹ بنا کر دیا کرتیں۔ سفید سفید دہی بڑوں پر کھٹی اور میٹھی چٹنی پڑی ہوئی اور اماں کے ہاتھ کے سیخ کے کباب، اماں کباب بنانے میں بہت ماہر تھیں..... کیسے فٹافٹ سیخ پر چڑھاتی اور اتارتیں۔

عید کی صبح وہ ابا کی انگلی پکڑ کر عید گاہ جاتا تھا۔ واپسی پر ابا ہمیشہ ڈھیر ساری مٹھائیاں خریدتے اور سب رشتہ داروں کے یہاں بانٹتے ہوئے آتے۔ محلے کے بچے ایک دوسرے کے گھر شیر خرما، فرنی، سویاں اور نہ جانے کیا کیا بانٹتے پھرتے تھے پھر عیدی بٹتی تھی۔ کتنا مزہ آتا تھا۔ اس کے گھر تو عید کے دن ایک سادہ سا کیک آجاتا تھا۔ قریبی مسجد میں نماز ادا ہو جاتی اور بس..... شام کو بچوں کو لے کر وہ کسی ریسٹورنٹ میں ڈنر کر آتے تھے اور ہو جاتی تھی عید۔

آہ..... منور! تو نے باہر جانے کی ضد میں کیا کیا کھو دیا۔ کمی تو وہاں بھی کچھ نہ تھی۔ ابا کی زمینیں تھیں اور آج بھی ہیں اور چلتا ہوا کاروبار ''مگر میں الگ سے خود کچھ کروں گا'' کی ضد نے سب کچھ چھڑا دیا۔ کیا ضرورت تھی تجھے۔

یادوں میں گھرا کب وہ اپنے گھر کے دروازے پر آپہنچا اسے پتا ہی نہ چلا۔ ''گھر'' اس نے حیرانی سے اپنے بدلے ہوئے گھر کو دیکھا۔ ابا نے پرانے گھر کو جدید طرز کا بنوا کر بہت خوبصورت کر لیا تھا۔ وہ پرانا دروں والا دروازہ تلاش کرتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ آہنی گیٹ، خوبصورت لان اور پھر دالان اور پھر دو کمرے۔ سائڈ میں داہنے ہاتھ پر باورچی خانہ، غسل خانہ اور پھر بیت الخلا۔ کتنا بدلا بدلا لگ رہا تھا سب کچھ۔ ابا نے اس کے بچوں کے لیے بہت خوبصورت کمرہ تیار کرایا تھا۔ ابا اور اماں سے ملنے کے بعد ڈیزی بچوں کو لے کر برابر والے کمرے میں چلی گئی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ روم شیئر کرنا اس کے مزاج میں نہیں، لیکن اس وقت کوئی اور چارہ بھی نہیں تھا۔ وہ تو سوچ رہا تھا کہ ابا' اماں اور گھر نہ جانے کن حالوں میں ہوگا۔ کوئی دیکھ بھال کرنے والا بھی تو نہیں تھا لیکن گھر پھر بھی صاف ستھرا تھا۔ کھانے کی خوشبو پورے گھر میں مہکی ہوئی تھی۔

چند منٹ بعد ابا نے کھانا لگنے کی اطلاع دی تو وہ سب کو لے کر ٹیبل پر آ گیا۔ ٹیبل دیکھ کر اسے حیرانی ہوئی۔ نئی چمچماتی شیشے کی ٹیبل جو ابا نے اس کی بیوی

www.zemtime.com

اور بچوں کی وجہ سے ڈلوائی تھی ورنہ وہاں تو آج بھی دسترخوان ہی لگتا تھا۔

''ابا! کھانا کس نے پکایا۔'' اس نے ڈھکن ہٹاتے ہوئے پوچھا۔

''بیٹا! ہمارے یہاں کوئی تنہا نہیں ہوتا۔ تمہیں تو پتا ہے تمہاری بہنیں پردیسن ہیں۔ صبح سے نور جہاں لگی ہوئی تھی۔ تمہارے بچوں کی پسند کا اسے پتا نہیں تھا۔ تو میں نے ٹماٹر پلاؤ اور قورمہ بنوالیا۔ مجھے یقین تھا کہ بھلے ہی تم پردیس میں ہو لیکن بچوں کو اپنے ملک کی تہذیب ضرور سکھائی ہوگی۔''

''نور جہاں'' میرے ہونٹ بدبدائے۔

''ہاں! بڑا خیال رکھتی ہے۔ سارا گھر سنبھالتی ہے۔ کبھی احساس ہی نہیں ہوا کہ ہمارا کوئی نہیں ہے۔ یہی تو یہاں کے رکھ رکھاؤ ہیں۔ خدمت گزاری، ایک دوسرے کی دیکھ بھال کرنا، اپنائیت، آنا جانا، سب بڑی قیمتی چیزیں ہیں۔ ان ہی سہاروں پر اپنی زندگی گزر رہی ہے۔''

''واقعی'' میں حیرت میں پڑ گیا۔ ''کیسی مٹی ہے اپنے دیس کی؟ نور جہاں جسے میں بڑی رعونت سے ٹھکرا گیا تھا۔ میری خالہ کی بیٹی۔ تو کیا وہ آج بھی کنواری ہے؟ سوالات نے مجھے گھیر لیا۔ میں الجھا الجھا سا بچوں کو کھانا کھلانے میں لگ گیا۔ ڈیزی کہہ کر کہ جا چکی تھی میں اسے میکی لا کر دے دوں۔''

ہفتہ بھر بعد ہی ڈیزی اور بچوں نے جانے کی ضد پکڑ لی۔ وہ یہاں ہم آہنگی پیدا نہیں کر پا رہے تھے۔ بقول ڈیزی کے کہ ''کھانے دیکھ دیکھ کر اسے ابکائیاں آتی ہیں اوپر سے اماں کی گیلی کھانسی اور ایک کمرے میں ہم سب کی رہائش، ناٹ پاسیبل۔''

''ڈیزی! میں تمہارا اور بچوں کا الگ کمرہ بنوا دوں گا۔ زمین تو بہت ہے بلکہ تم اپنے حساب سے پورا گھر بنوا لینا۔ کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ تم فی الحال چلی جاؤ۔ کچھ وقت بعد آجانا۔ پلیز یہ تو کرنا ہی ہوگا۔ میں نے تم سے شادی کے وقت بھی کہا تھا کہ مجھے اپنے ملک بھی لوٹنا پڑ سکتا ہے۔ اس وقت تو تم نے ہاں کر لی تھی۔ یہ ہمارا ملک ہے۔ اب ہمیں یہیں رہنا ہوگا۔

''نہیں منور! یہ تمہارا ملک ہے ہمارا نہیں۔ جس طرح تم اپنے ملک میں رہنا چاہتے ہو اسی طرح میں اور بچے اپنے ملک میں خوشی خوشی رہ لیں گے۔ تم یہیں رہ لو۔''

اس نے لمحے بھر میں رشتہ توڑنے کی بات کر ڈالی اور یہاں ٹوٹے ہوئے رشتے بھی بنھائے چلے جا رہے ہیں۔ میرے تصور میں سانولی سی نور جہاں گھوم گئی۔

''ڈیزی' یہ اتنی آسانی سے تم کیسے کہہ گئیں؟'' میں نے ششدر ہو کر کہا۔

''ہاں منور! میں اور بچے یہاں نہیں رہ پائیں گے اور ہم رہنا بھی نہیں چاہتے ہاں تم رہ لو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ منور تم اماں بابا کو اولڈ ایج ہوم میں بھیج دو۔ پورا خرچا اٹھاتے رہنا' مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہوگا لیکن میں.....''

''ڈیزی! یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ میں انھیں.....''

''ڈیڈی! مما ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ ہمارے یہاں تو سب بوڑھے لوگ وہیں رہتے ہیں تو.....''

میں حیرانی سے ان کا منہ تکتا رہ گیا' مجھ پر واضح ہو گیا تھا کہ وہ رکنے والے نہیں۔ بچے اگلے پندرہ دن میں چلے گئے اور میں اماں بابا کے پاس رہ گیا۔ گھر کا سارا انتظام اب بھی نور جہاں سنبھالے ہوئے

اردو خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوب صورت تحفہ

ذرد موسم

راحت جبیں

قیمت -/1000 روپے

منگوانے کا پتہ

مکتبہ عمران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار کراچی۔ فون نمبر 32735021

www.zemtime.com

تھی۔ وہ کس وقت آتی کام کرتی اور چلی جاتی مجھے تو پتا بھی نہ چلتا۔ میرا تو اس سے اب تک سامنا بھی نہیں ہوا تھا۔

''منور! اب کیا ہوگا تیرا؟ تو تو تنہا رہ گیا۔ ڈیزی اور بچے اب لوٹنے والے نہیں۔ بچے عمر کے اس دور میں داخل ہو چکے تھے جہاں اپنی مرضی زندگی کے فیصلوں میں شامل ہوتی ہے اور ویسے بھی وہ اس ملک کے تو تھے نہیں۔ جو بڑوں کے فیصلوں کے آگے سر جھکا دیتے اور تو نے کون سا اپنا سر جھکا دیا تھا ابا کے فیصلے کے آگے؟''

اسے بابا کے جملے یاد آئے کہ بیٹا جا تو رہے ہو لیکن جب فیصلے کا وقت ہوگا تو بڑا خسارہ بھی اٹھانا پڑ سکتا ہے۔''

کتنا صحیح کہا تھا ابا نے۔ سوچتے سوچتے اس کا خیال پھر نور جہاں کی طرف چلا گیا۔

''نور جہاں! وہ اب تک کس کے انتظار میں ہے؟ کیا میرے؟''

اس کے اندر کے خود غرض مرد نے سر ابھارا۔

کئی دن گزرنے کے بعد وہ خالہ کے گھر پہنچ گیا۔ خالہ کا گھر بھی چندن بنا ہوا تھا۔ خالو حقہ پی رہے تھے۔ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ خالہ اور خالو سے باتوں کے درمیان اسے پتا چلا کہ نور جہاں نے شادی ہی نہیں کی اور وہ ہی اماں ابا کے ساتھ سوتی رہی ہے۔ اپنے اندر کی دبی خواہش کا اظہار کرنا چاہتا تھا لیکن اس سے پہلے وہ نور جہاں سے ملنا چاہتا تھا۔

''خالو! میں نور جہاں کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ کہاں ہے وہ؟''

اس نے نظریں گھمائیں تو کمرے کی آڑ میں اسے اس کی ایک جھلک نظر آئی۔

''اپنے کمرے میں ہے۔ چلے جاؤ۔''

نہ کوئی شکوہ نہ شکایت، کتنی اپنائیت ہے یہاں کے لوگوں میں۔ اس نے خالو کو دیکھا اور پھر نور جہاں کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ نور جہاں نے دور سے ہی اس کے قدموں کی آہٹ اور اس میں چھپے خود غرضی کے سوالات بھانپ لیے تھے اسی لیے جیسے ہی وہ اس کے کمرے کے بالکل قریب گیا اور ہولے سے اسے پکارا اس نے جھٹ سے دروازہ بند کر لیا۔

اس کا ہاتھ اٹھا کا اٹھا رہ گیا۔ اسے جواب مل گیا تھا۔ بے غرض، بے لوث محبت کرنے والے یہ لوگ جنھیں اس نے خود غرضی کے ترازو میں تولنے کی کوشش کی۔ وہ اپنا سا منہ لے کر واپس پلٹ آیا۔

نور جہاں اس کے بچپن کی مانگ تھی اور اسے پسند بھی تھی لیکن ملک سے باہر جانے کے جنون نے اس کے اندر اس کے لیے بے اعتنائی پیدا کر دی اور وہ اسے کالی کہہ کر چھوڑ کر چلا گیا۔ دراصل وہ اپنے گلے میں بیوی نام کا پھندا ڈال کر جانا ہی نہیں چاہتا تھا کہ کہیں اس کے نام پر چند مہینوں میں واپسی نہ کرنی پڑ جائے۔ وہاں جا کر اس نے خوب انجوائے کیا اور پھر کچھ عرصہ بعد ڈیزی سے شادی کر لی۔ ڈیزی کی ماں پاکستانی خاتون تھیں اور آج جب وہ اپنی غرض سے اس کی واپسی چاہتا تھا تو اس نے اسے صاف جواب دے دیا تھا۔

''آہ..... منور! اب یہی تیری زندگی ہے۔ اماں ابا کی خدمت اور اس گھر میں آنے والے وقت کے ساتھ قید تنہائی۔ یہ کفارہ تو ادا کرنا ہی پڑے گا۔ اسے پتا تھا کہ اگر اب وہ اپنے ملک واپس نہ آتا تو چند سالوں بعد اس کے بچے اسے اولڈ ایج ہوم میں چھوڑ آتے۔

یہاں اسے یہ تو یقین تھا کہ کوئی رشتہ کسی سے نہ ہوتے ہوئے بھی لوگوں میں آج بھی ایک دوسرے کا خیال رکھنا، خدمت گزاری، وفاداری، ایثار اور صلہ رحمی اتنی زندہ ہے کہ تنہائی کی زندگی میں بھی سکون میسر ہو سکتا ہے۔ اس نے ابا کی کھانسی روکنے کو ان کی کمر سہلائی اور اپنی غلطیوں کے کفارہ کے بارے میں سوچنے لگا۔

☆

www.zemtime.com